ادب کے شعبہاے لطیفہ میں مصنف اپنی کتاب کے ہر ہر لفظ اور ہر ہر خیال کو تولتا اور کتاب کے تمام اجزا میں توازن و تناسب پیدا کرتا ہی۔ کتاب کا حُسن اسی تناسب کا نتیجہ ہی اور اسی تناسب میں فرق آجانے سے کتاب کے حُسن میں بھی فرق آجاتا ہی۔

مثنوی میں اس حُسن کا قایم رکھنا کوئی آسان کام نہیں ہی۔ شاعری کے جملہ اصناف میں یہی صنف ایسی ہی جس میں ضخیم سے ضخیم کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ لیکن جسقدر اس کا میدان وسیع ہی اُسی قدر اس کی مرحلہ پیمائی دشوار ہی۔ ہر قسم کے خیالات، جذبات اور واقعات پر قلم اُٹھانا پڑتا ہی اور شاعر کی تمام خصوصیات اور محاسن اس کی تکمیل اور آرایش میں صرف کرنے پڑتے ہیں۔ شاعری کا جو کمال ہومر اور شکسپیر کے یہاں نظر آتا ہی اُس کا عکس ہماری شاعری میں سب سے زیادہ اسی صنف یعنی مثنوی میں ہوسکتا ہی۔ لیکن ذرا غور کرو کہ بے شمار مثنوی نگاروں میں کتنے ہیں جو اس معیار پر پورے اُترتے اور فردوسی و نظامی اور خسرو کے پہلو بہ پہلو بیٹھنے کا استحقاق رکھتے ہیں۔

اگرچہ ہمارا یہ کہنا کسی دوسرے کے لیے بُرہان نہیں ہوسکتا کہ خسرو کی طبعزاد مثنویاں تناسب کے معیار پر پوری اُترتی اور ہمارے ذہن میں حُسن کا تصور پیدا کرتی ہیں، لیکن ہمیں یقین ہی کہ مذاقِ سلیم اور وجدانِ صحیح اس کتاب کے پڑھنے والوں کو خود اس نتیجہ کی طرف راہبری کریگا۔ ناظرین اس مثنوی کے پڑھتے وقت ان خیالات کو پیشِ نظر رکھیں اور خود اندازہ کریں کہ شاعر نے مختلف داستانوں کے باہمی ربط اور مختلف اجزا کے باہمی تناسب میں کس حد تک کامیابی حاصل کی ہی۔ جو عمارت اس نے ایک ایک لفظ چُنکر بنائی جو نقش و نگار

اس نے ایک ایک خیال لیکر کھینچے اور جو راگ اس نے ایک ایک حرف جوڑ کر پیدا کیا ہی اُن سے کہاں تک خسرو فنون لطیفہ کے بڑے اُستادوں کی صف میں جگہ پانے کا مستحق قرار پاتا ہی۔

(۳)

قران السّعدین کے بعض نسخوں پر اس مثنوی کا نام "مثنوی درصفتِ دہلی" لکھا ہوا پایا گیا ہی اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہی کہ مثنوی مذکور میں خسرو نے جہاں مختلف اشیاء کے "صفات" لکھے ہیں، وہاں دارالسّلطنت اور اُس کی مشہور عمارات وغیرہ کی توصیف بھی کی ہی۔

قران السعدین سے محققینِ آثارِ قدیمہ کو کیقباد کے عہد میں دہلی کے متعلق بعض مستند حالات معلوم ہو سکتے ہیں جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

دہلی کو اس عہد میں قبۃ الاسلام کے لقب سے نامزد کیا جاتا تھا ؎

"قبۂ اسلام شدہ در جہاں
بستہ او قبۂ ہفت آسماں" (صفحہ ۲۹)

شہر پہاڑی پر آباد تھا اس کے گرد دو میل تک باغ تھے اور دریاے جمنا اُس کے قریب آبیاری کرتا تھا ؎

شہر نہ بل بحر عجائب نما بحر وسے گشت بکوہ آشنا
زاں بدلِ کوہ گرفتہ قرار تاکند اقلیم عدو سنگسار (صفحہ ۳۲)

تابدو فرسنگ به پیرامنش　　　روضۂ باغ و چمن گلشنش
(صفحہ ۳۴)

تافلک از جون بدو داده آب
دجلہ رواں بر دبغداد آب　(صفحہ ۳۴)

دہلی میں اس زمانہ میں تین حصار تھے، دو پرانے، ایک نیا ۔

از سہ حصارش دو جہاں یک مقام
وز دو جہاں یک نفسش دہ سلام　(صفحہ ۲۸)

(۱) حصنِ بردنیش ز عالم بروں　　　عالمِ بیرونش بحصن اندروں
(۲) حصنِ درونیش تو گوئی مگر　　　چرخ بزیر ست و حصارش زبر
(۳) گفت حصارِ نو او را سپہر　　　کاے فلکِ نو بکہن دار مہر
ملک ز دروازۂ او فتح باب　　　سیزدہ دروازہ و صد فتح باب
ہر دم ازاں قلعۂ مینو سرشت　　　قلعۂ فیروزہ شدہ خشت خشت (صفحہ ۲۸-۲۹)

پہلے دو حصاروں میں ایک جو باہر کی طرف تھا غالباً قدیم دہلی کی شہر پناہ ہی اور حصار اندرونی شہر کا شاہی قلعہ۔ حصارِ نو سے غالباً حصارِ شہرِ نو واقع کیلو کھری مراد ہی۔ کیلو کھری کا محل وقوع دہلیِ کہنہ سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر شمال مشرق کی جانب جمنا کے غربی کنارے پر ہی۔ یہیں پر کیقباد نے ایک قصر تعمیر کیا تھا جس کی مفصل کیفیت قران السعدین میں بدیں عنوان لکھی ہی ۔

صفتِ قصرِ نو و شہرِ نو اندر لبِ آب

کہ بود عرصۂ رفرف چو رفِ آں ایواں (صفحہ ۵۴)

ضروری اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ؎

رفت بکلوکھری و داد عوں | از مددِ دست چو دریاے جوں
قصر شد از فرِ شہ ارجمند | چوں فلک از منزلتِ خود بلند
قصر نگویم کہ بہشتے فراخ | روفتہ طوبی درِ او را بشاخ
بامِ سفیدش بفلک سودہ سر | کرد بخورشید سفیدی ابر
آئینہ گشتہ زگچِ صاف خشت | دید درِ او صورتِ خود را بہشت
شکلِ ستونش بمقامِ ستاد | قصرِ ارم راشدہ ذات العماد
طرفہ عروسے شدہ آراستہ | آئینہ از آبِ رواں خواستہ
جوں گزو گشت حبابے عیاں | قصرِ نمود از تہِ آبِ رواں
ہمچو دو آئینہ مقابل زتاب | آب رو عکس نما او در آب
طاقِ بلندش بفلک گشت جفت | حاملِ او شد فلک اندر نہفت
کنگرِ طاقش بزبانِ دراز | پیشِ فلک گفت سخنہای راز
سنگِ سفیدش کہ شدہ برسپہر | آمدہ از مہر و شدہ ہم بمہر
یک طرفش آب و دگر سوی باغ | باغ و لبِ آب زد و سوش بلاغ
شاخ بہر بارگہِ کردہ راہ | جاتکیہ بار شدہ بارگاہ

(صفحہ ۵۴-۵۶)

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہی کہ شہرِ نو جمنا کے قریب واقع تھا اور قصرِ نو دریا کے عین کنارے پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اور اس کا عکس دریا میں پڑتا تھا۔ نیچے کا حصہ اینٹوں سے بنا تھا، جس پر چونہ اور سفیدی ہو رہی تھی۔ اوپر کے حصہ میں سنگِ سفید لگا تھا اس قصر کے ایک طرف جمنا تھی، اور دوسری طرف باغ تھا، جو بارگاہ سے اسقدر قریب تھا کہ درختوں کی شاخیں بارگہ کے اندر داخل ہوتی تھیں۔ ع

جائگہِ بار شدہ بارگاہ

اس مصرع میں لفظ بار میں لطیف ایہام ہی معنی مقصود یہ ہی کہ بارگاہ قرب باغ کے باعث شاخوں کے داخل ہونے کی وجہ سے پھلوں کے رکھنے کی جگہ ہو گئی ہی۔ معنی قریب جن کی طرف پہلی نظر میں ذہن منتقل ہوتا ہی یہ ہیں کہ "بارگاہ" دربار کی جگہ ہی۔ غرۃ الکمال میں بھی قصرِ معزی کی تعریف میں ایک چھوٹی سی مثنوی ہی جس کے چند اشعار درج ذیل کیے جاتے ہیں ۔

زہے فرخندہ قصرِ آسماں سائے	کہ ہست از رفعتش بر آسماں جائے
برُوئے آب فردوسِ جہاں تاب	کجا فردوس خود باشد بریں آب
بآبِ جون دادہ صنعت دلون	زمیں پوشیدہ ریشش لبِ جون
خیالِ قصر کاندر آب زد تاب	فلک را سرنگوں افگند در آب
نظیرے ایں چنیں قصرے محالست	مگر در آب بینی واں خیالست
زمینش مہ بلندی آسماں گیر	مبارک باد بر شاہِ جہاں گیر

معزالدیں کہ دنیا را بیاراست — زنامش دین و دنیا را بیاراست

شہنشاہ کیقباد آں افسرِ ملک — کہ چوں افسر برآمد بر سرِ ملک

خداداد ست در ایامِ جوانی — ببیں ملکے چو ملکِ جاودانی

بعض گزشتہ اور موجودہ مؤرخین نے "شہر نو" کی تعمیر کو بھی غلطی سے معزالدین کیقباد کی طرف منسوب کیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ "شہر نو" اس نام سے کیلوکھری میں پہلے ہی سے آباد تھا۔ چنانچہ جلوسِ ناصری کے پندرھویں برس ۶۵۸ھ میں جس وقت ہلاکو خاں کے سفیر ناصرالدین محمود کے دربار میں پیش ہوئے اُس وقت (بقول صاحب طبقات ناصری جس نے یہ حالات چشم دید بیان کیے ہیں) دو لاکھ پیادہ اور پچاس ہزار سوار اور اہالیانِ دہلی کی بیس بیس صفیں دو طرفہ "شہر نو" واقع کیلوکھری سے لیکر قصرِ شاہی واقع دہلی تک پھیلی ہوئی تھیں۔ سفرا شہرِ نو سے جانبِ دارالسلطنت روانہ ہوئے۔

"بقدرِ دو لک پیادہ تمام بحضرت آمدہ و بقدرِ پنجاہ ہزار سوار آمادہ برگستوال
و بیرق و تعبیہ ساختہ و خلق و عوامِ شہر از معارف و اوساط و ارزوال چنداں
مرد از سوار و پیادہ بیروں رفت کہ از "شہر نو" کیلوکھری تا درونِ شہر کہ
قصرِ سلطنت بود بیست صف مرد پشت بہ پشت چوں باغ فراہم یافتہ کتف بر کتف
نہادہ صف در صف ایستادہ۔۔۔۔ چوں رُسلِ ترکستان از "شہر نو"
برنشستند الخ"

اس کا بہترین ثبوت کہ شہرِ نو کی بنیاد کیقباد نے نہیں ڈالی خود خسرو کے بیان سے

مترشح ہے۔ "صفتِ قصرِ نو و شہرِ نو اندر لبِ آب" میں اُنھوں نے صرف قصر کی تعریف کی ہے اور اسی کو کیقباد کی طرف منسوب کیا ہے۔ "شہرِ نو" کے متعلق کچھ نہیں لکھا حالانکہ یہ امر بیّن ہے کہ اگر شہرِ نو میں قصر کے علاوہ کوئی حصّہ معزالدین کا تعمیر کیا ہوا ہوتا تو اس کا ذکر وہ ضرور کرتے۔ علاوہ ازیں کیقباد ۶۸۶ھ میں تخت پر بیٹھا اور اگر یہ مان لیا جائے کہ اُس کا جلوس اوائل سال میں وقوع میں آیا (اور قرائن کا یہی تقاضا ہے) تو ذوالحجہ ۶۸۶ھ تک جبکہ بادشاہ دارالسّلطنت سے روانہ ہو کر کیلوکھری قصرِ معزی کو گیا ہے کسی طرح نیا شہر بنا قیاس میں نہیں آسکتا۔ اسقدر قلیل مدّت صرف ایک عالی شان محل کی تعمیر کے لیے کافی ہے۔

قصر کی تعمیر کے بعد کیقباد کا اس کو اپنا دارالسّلطنت قرار دے لینا خود ظاہر کرتا ہے کہ شہرِ نو اس کے زمانہ میں اسقدر آباد تھا کہ فوراً دارالسّلطنت بنا لینے میں کوئی دقّت نہیں ہوئی چنانچہ جب کیقباد کے بعد جلال الدین خلجی تخت پر بیٹھا تو اس نے اس مقام کو اپنا دارالسّلطنت منتخب کر لینے میں کوئی دقت نہیں دیکھی۔ البتہ اس کے زمانے میں اس شہر کو ترقی حاصل ہوئی۔

دہلی کی عمارات اور آثار میں اس زمانے میں تین چیزیں امتیازِ خاص رکھتی تھیں مسجد جامع، منارہ ماذنہ، اور حوضِ سلطانی۔ خسرو نے اور بھی جہاں کہیں دارالسلطنت کی یاد کی ہے انھیں تین چیزوں کو خصوصیت کے ساتھ شمار کیا ہے[1]

[1] مثلاً دیکھو مثنوی تحفۂ خط غرۃ الکمال بنام تاج الدین زاہد ازادرہ

مسجد جامع کے متعلق حسبِ ذیل اشعار قابلِ غور ہیں ؎

غلغلِ تسبیح گنبد در دوں	رفتہ زنہ گنبدِ والا بروں

گنبدِ او سلسلہ پیوند راز	سلسلہ چوں کعبہ شدہ حلقہ ساز

در تہ سقفش زسما تا زمیں	نصب شدہ جملہ ستونہائے دیں (صفحہ ۳۰)

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مسجد مذکورہ میں نو گنبد تھے مسجد کی چھت کے نیچے جابجا ستون قایم تھے ؎

در تہ سقفش زسما تا زمیں	نصب شدہ جملہ ستونہائے دیں

یہ وہی ستون تھے جو مسجد مذکورہ کی تعمیر سے پہلے رائے پتھورا کے مندر میں لگے ہوئے تھے ان میں سے کچھ ستون اس وقت بھی موجود ہیں اور مسجد مذکور کا محل وقوع بتاتے ہیں

منارہ کے متعلق ؎

شکلِ منارہ چو ستونے زسنگ	از پئے سقفِ فلکِ شیشہ رنگ

آں کہ ززر بر سرش افسر شدہ است	سنگ زنزدیکیِ خور زر شدہ است

سنگِ وے از بس کہ بخورشید سود	زرد زرِ خورشید عیارے نمود

سنجرِ سنگیں کہ ستونِ سپہر	آمدہ از مہر شدہ ہم بمہر

از پئے بر رفتنِ ہفت آسماں	کرد زمیں تا بفلک نردباں

گرد سرش کرد موذن چو گشت	قامتش از مسجدِ عیسے گذشت

موذنش آں جا کہ اقامت کشید	قامت موذن نتواند رسید (صفحہ ۳۱)

اِس سے معلوم ہوتا ہی کہ یہ منارہ ماذنہ تھا۔

بعض محققینِ آثار کو (جن کی نظر سے غالباً یہ اشعار نہیں گزرے) اس سے انکار ہی۔ لیکن خسرو کا بیان سندِ قطعی ہی۔ اور اس میں کوئی شبہ کی گنجایش نہیں۔ فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں منارۂ مذکور میں بجلی گرنے سے خلل آگیا تھا اور اُس نے اوپر کے حصّہ میں بہت کچھ اضافہ اور ترمیم کی، لیکن خسرو کے زمانے میں یہ منارہ اصلی حالت میں موجود تھا۔ اور ابن بطوطہ نے بھی ترمیم مذکور سے کچھ ہی دن پہلے محمد تغلق کے عہد میں اس منارہ کو دیکھا تھا۔ خسرو کے بیان سے معلوم ہوتا ہی کہ منارۂ مذکور کے اوپر چتر (یا قبّہ) بنا ہوا تھا جس کا اوپر کا حصّہ سونے کا تھا۔ ابن بطوطہ کی اس مینار اور چتر کے متعلق حسب ذیل عبارت ہی:

"یہ مینار سُرخ پتھر کا بنا ہوا ہی۔ حالانکہ مسجد سفید پتھر کی ہی۔ مینار کے پتھروں پر نقش کندہ ہیں اور اُن کا اوپر کا چتر خالص مرمر کا ہی اور لٹّو زرِ خالص کے ہیں"

خسرو اور ابن بطوطہ کے بیانات پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہی کہ منارۂ مذکور بحالتِ اصلی محض سُرخ پتھر کا تھا، جس کے اوپر ایک سنگِ مرمر کا چتر تھا اور چتر کے لٹّو اور کلس (غالباً) سونے کے تھے۔ افسوس ہی کہ جہاں تک ہمیں معلوم ہی خسرو نے کہیں اسکے متعلق کنایتہً بھی ذکر نہیں کیا کہ اُس زمانے میں مینار مذکور کے کتنے درجے تھے۔

حوضِ سُلطانی کے متعلق ؎

در کمرِ سنگ میانِ دو کوہ / آبِ گہر صفوت و دریا شکوہ
ساختہ سلطانِ سکندر صفات / در سدِ کوہ آئینۂ ز آبِ حیات
شہر گراز وے نبود آب کش / کس نخورد در ہمہ شہر آب خوش
در تہِ آبش ز صفا ریگِ خُرد / کور تواند بدلِ شب شمرد
سیلِ وے آہنگ بکہسار کرد / کوہ تبر دامنے اقرار کرد
چوں مد و جزر بش ز نشیب و فراز / ز آب ز کوہ آمدہ و رفتہ باز
چوترہ و قصر بلندش در آب / گشت ازاں ساغرِ صافی حباب
رو دسبے زو شدہ تا آبِ جون / جوں زپئے آب از دو جستہ عون
گرد وے از اہلِ تماشا گروہ / دامنِ خیمہ شدہ دامانِ کوہ (صفحہ ۳۲-۳۳)

اِن اشعار سے ثابت ہوتا ہی کہ یہ حوض جس کو سلطان التمش نے (سنہ ۶۲۷ھ ۱۲۲۹ء میں) تعمیر کیا تھا دو پہاڑوں کے بیچ میں واقع تھا اور اس کی منڈیں دامان کوہ سے ٹکرائی تھیں تمام شہر کو میٹھا پانی یہیں سے دستیاب ہوتا تھا۔ دریاے جمنا سے اس حوض تک بہت سے نالے نکالے گئے تھے۔ پانی ایسا صاف شفاف تھا کہ تہ کی ریگ دکھائی دیتی تھی۔ بیچ حوض میں ایک چبوترہ بنا ہوا تھا جس پر ایک عمارت بھی قایم تھی۔ شہر کے لوگ تفریح طبع کے لیے یہاں آتے اور دامنِ کوہ پر خیمہ زن ہوتے تھے۔

علاء الدین کے زمانہ میں اس حوض کی مرمت ہوئی تھی اور بیچ میں ایک خوشنما گنبد تعمیر کرا دیا گیا تھا۔ قران السعدین کے بیان سے یہ امر ثابت ہوتا ہی کہ اس گنبد سے پہلے

التمش کا چبوترہ موجود تھا۔

اس مثنوی میں خسرو نے علاوہ دہلی کے خاص اُس کے مضافات و حوالی کا بھی ذکر کیا ہے۔

کیقباد اپنے لشکر کے ساتھ دارالسلطنت سے روانہ ہو کر سیری میں خیمہ زن تھا

کوکبۂ زیں نمط انجم شمار / رفت بروں با علم شہریار
نصب شد اعلام مبارک لوا / کرد سراپردہ بسیری نزول
بارگہ شاہ دراں بوستاں / روے ظفر داشت بہندوستاں (صفحہ ۵۱)

بارگہ خاص بسیری رسید / سبزۂ تر بر سر سبزی رسید
دائرۂ خیمہ بسیری قطار / ابر فرود آمدہ در مرغزار
بس کہ دراں گلشنِ مینو نشاں / شاہ شد از ابر کرم دُر فشاں
ہر کہ دریں سبزہ نظر درگرفت / قطرہ طلب کرد و گہر بر گرفت (صفحہ ۵۲)

اِن اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں "سیری" سبزہ زار تھا۔ کوئی تیرہ یا چودہ برس بعد علاء الدین نے حملۂ مغل کے وقت دہلی سے نکل کر اسی میدان میں جنگ کی تھی اور فتحمند ہونے پر بطور فالِ نیک اپنے دارالسلطنت کے لیے اس موقع کو انتخاب کیا تھا۔ اس کے جانشین کیقباد [خوارزمی] نے حصار و عمارات سیری کی تکمیل کی۔ اور اس کا نام "دارالخلافہ" رکھا۔ یہ حالات مفصل طور پر امیر خسرو نے مثنوی نہ سپہر میں لکھے ہیں حوالی شہر میں تلپت، اندپت اور افغان پور کا بھی ذکر کیا ہے۔

میمنہ بر تلپتہ زد یکسرہ　　بود میان اندپتہ میسرہ
پیل گران سنگ بہ بہاپور بود　　قلب چو دریاش در آمد بجو د
پیش بہاپور بعہد سہ میل　　سنگ گران سرشدہ از پای پیل (صفحہ ۵۲)

لشکرِ شاہی کا سیدھا بازو تلپت میں، الٹا اندپت میں، و بہاپور میں قلب لشکر تھا۔ اندپت (آزاندرپت یا اندرپرست) کا محلِ وقوع دہلی کہنہ سے ساڑھے ۹ میل شمال مشرق کی طرف ہے جہاں فی زمانہ پرانا قلعہ یا قلعہ دین پناہ ہمایوں بنا ہوا ہے۔

تلپت کا ذکر ابن بطوطہ نے بھی کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ "تلپت دہلی سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر ہے"۔ اب بھی اس نام کا ایک پرانا گاؤں متھرا کی سڑک کے پاس ضلع دہلی میں دہلی سے کوئی تیرہ میل جنوب مشرق کی طرف واقع ہے۔ اس زمانے کی تاریخوں میں اس کا ذکر کثرت سے پایا جاتا ہے۔ دہلی سے پورب کو آتے جاتے جمنا کو پار کرتے وقت یہ مقام ملتا ہے۔

بہاپور: اس کا محلِ وقوع خسرو کے بیان سے اس طرح تحقیق ہوتا ہے کہ وہ اندپت اور تلپت کے بیچ میں تھا۔ بدایونی نے دو جگہ اس کا ذکر کیا ہے ایک تو اس موقع پر جب کیقباد کے مرنے سے پہلے جلال الدین خلجی نے شمس الدین کیکاؤس کو (جسے اہالی دہلی نے تخت نشین کر دیا تھا) بہارپور میں جہاں جلال الدین خود مقیم تھا نظر بند کر لیا۔ اور دوسرے اس موقع پر جب کیقباد کے قتل ہونے کے بعد بہاپور میں کیکاؤس کو تخت نشین کیا گیا۔

"شہر نو" (کلوکھری) روانہ ہو کر بادشاہ نے پہلی منزل حدودِ تلپت و افغان پور پر

نقشہ دہلی قدیم مع مضافات بعہد معزالدین کیقباد (۶۸۶-۶۸۹ھ)

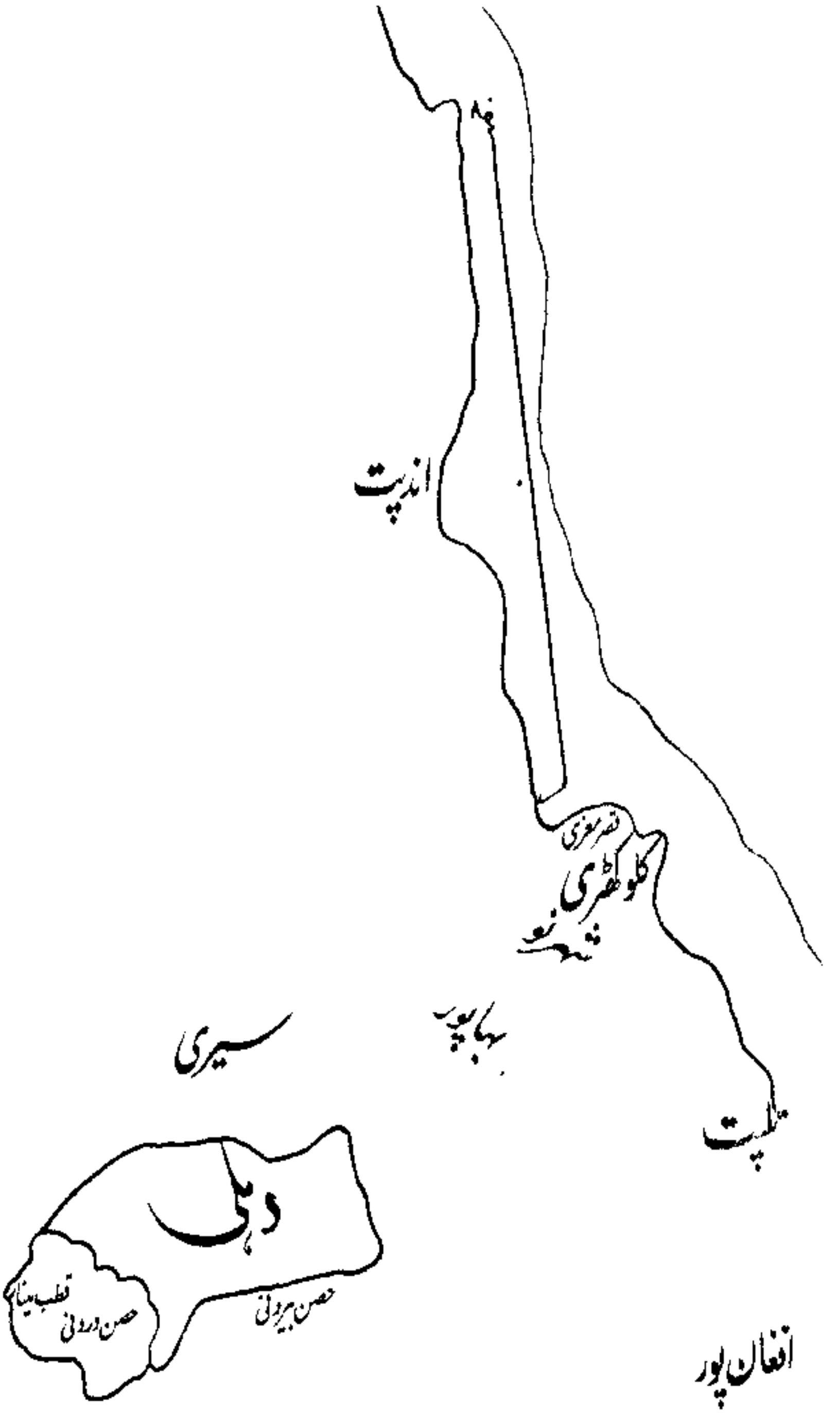

میں کی ہے

کوچ سپہ کرد شہ از شہر نو داد جہاں را ز ظفر بہر نو
منزلِ اوّل کہ شد از شہر دُر بود حدِ تلپت و افغان پور
یافت سراپردہ دراں جا مقام دشت در آمد ز رَسَنہا بدام (صفحہ ۸۹)

افغان پور کا محل وقوع بدایونی نے تغلق آباد سے تین کوس بیان کیا ہے یہیں پر بنگال سے واپس ہوتے ہوئے محمد تغلق نے اپنے باپ غیاث الدین تغلق کا اُس محل میں استقبال کیا تھا جو غیاث الدین پر گر کر اس کی موت کا موجب ہوا۔

(دیکھو ابن بطوطہ اور بدایونی)

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ افغان پور تغلق آباد سے تین کوس مشرق کی طرف واقع تھا جو جمنا کو عبور کرنے کے بعد تغلق آباد کے راستہ میں پڑتا تھا۔

اِن مضافات کے محلّ وقوع کو سمجھنے کے لیے ہم جداگانہ ایک سرسری خاکہ اُس وقت کی دہلی کا دیتے ہیں۔ (دیکھو نقشہ مقابل صفحہ ہٰذا)

(۴)

قران السعدین کا سلسلۂ تواریخ و شہور و سنین

خسرو نے قران السعدین میں کیقباد کی تخت نشینی کا سال ۶۸۶ھ بیان کیا ہے۔ لیکن خلافِ عادت جلوس کی تاریخ اور مہینہ نہیں دیا۔ دوسری مثنویوں مثلاً نُہ سپہر، فتح الفتوح تغلق نامہ وغیرہ میں وہ نہ صرف تاریخ اور دن دیتے ہیں بلکہ ساعت اور زائچہ

تک بیان کر دیتے ہیں۔ مثنوی کے واقعات کے متعلق بجز دو مقامات کے اُنھوں نے کہیں پر سنہ نہیں دیا۔ حالانکہ بعض جگہ مہینوں کا ذکر کیا ہے اور ہر جگہ واقعات کے ساتھ موسموں اور فصلوں کی کیفیت بیان کی ہے۔

سال جلوس کے علاوہ جو دوسرا سنہ اُنھوں نے بیان کیا ہے وہ مثنوی کے ختم ہونے کی تاریخ یعنی رمضان ۶۸۶ھ ہے ؎

ساختہ گشت از روشِ خامۂ — از پسِ شش ماہ چنیں نامۂ
در رمضاں شد بسعادت تمام — یافت قراں نامۂ سعدین نام
آنچہ بتاریخ ز ہجرت گزشت — بود سنہِ ششصد و ہشتاد و ہشت (صفحہ ۲۳۰)

دوسرے واقعات کی تاریخ کا سلسلہ اسی تاریخ کے ذریعہ سے اس طرح قایم ہوتا ہے۔

(۱) خسرو نے یہ مثنوی اَودھ سے لوٹ کر رمضان ۶۸۶ھ میں چھ مہینے کی محنت کے بعد لکھی۔

(۲) اُن کا دہلی پہنچنا ماہِ ذیقعدہ میں ہوا ؎

ہمچو مہ عید خوش و شاد و بہر
(صفحہ ۲۲۲)
در مہِ ذیقعدہ رسیدم بشہر

مثنوی کی تصنیف میں جو چھ مہینے صرف ہوئے اُن کا لحاظ رکھتے ہوئے اس مہینے سے ذو القعدہ ۶۸۷ھ مقصود ہے۔

(۳) بنا بریں باقی مثنوی کے تمام واقعات ذو القعدہ ۶۸۵ھ اور جلوس کیقباد ۶۸۶ھ کے مابین ہوئے۔

(۴) بادشاہ اخیر ذی الحجہ میں دہلی سے کلوکھری گیا تھا، اور وسط ربیع الاوّل میں لشکر کی روانگی جانبِ اَودھ ہوئی تھی۔

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ دار السلطنت سے کیقباد ذی الحجہ ۶۸۶ھ میں اور لشکر وسط ربیع الاوّل ۶۸۷ھ میں روانہ ہوا۔

(۵) جیسا کہ اُنھوں نے منظوم خط میں بیان کیا ہے دو مہینے کے سفر کے بعد لشکر اَودھ پہنچا۔ اس حساب سے لشکر کا پہنچنا وسط جمادی الاولیٰ ۶۸۷ھ میں ہوا یہی مہینہ قران السّعدین کے خاص واقعہ یعنی ملاقات کا سمجھنا چاہیئے۔

قران السعدین میں ملاقات کے طالع و وقت وغیرہ کے بیان ہیں (دیکھو صفحہ ۱۶۷) حسب ذیل شعر بھی درج ہے۔

تیرہ شبے دمہ گردوں بخواب
ماہِ زمیں منتظرِ آفتاب (صفحہ ۱۶۸)

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اخیر جمادی الاولیٰ ۶۸۷ھ میں وقوع میں آیا۔

(۶) میں جلوسِ کیقباد کی تاریخ ۶۸۶ھ کے نصف اوّل میں قرار دیتا ہوں اس لیے کہ ذی الحجہ ۶۸۶ھ سے پہلے قصرِ شاہی کلوکھری میں تعمیر ہو چکا تھا اور ناصر الدین محمود بلبن کی وفات اور کیقباد کی تخت نشینی کی خبر پاکر لکھنوتی (بنگال) تو

چلکر اَوَدھ پر لشکر کشی کر چکا تھا۔ ان واقعات کے لیے میرے خیال میں کئی مہینے درکار ہیں۔

اِس مثنوی میں خود اپنے متعلق امیر خسرو کا بیان غور طلب ہے وہ لکھتے ہیں کہ ؎

دربار معزی میں باریاب ہونے سے پیشتر اَوَدھ میں چھ مہینے رہے ۵

باعَلَمِ فتح دراں راہِ دور — سایہ فشاں شد بحدِ کنتیور

خانِ جہاں حاتمِ مفلس نواز — گشت باقطاعِ اَوَدھ سرفراز

من کہ بُدم چاکرِ او پیش ازاں — کرد کرم زانچہ بُد بیش ازاں

در اَوَدھم برد بہ لطفے چناں — کیست کہ از لطف بتابد عناں

غربت از احسانش چنانم گذشت — کم وطنِ اصل فراموش گشت

در اَوَدھ از بخششِ او تا دو سال — ہیچ غم و نالہ نبود از منال

من نپئے شرمِ خداوندِ خویش — رفتہ زجائے خود و پیوند خویش (صفحہ ۱۲۲)

اس بیان سے ظاہر ایسا مترشح ہوتا ہے کہ وہ دو برس تک مسلسل دہلی سے جدا اَوَدھ میں خان جہاں کے ساتھ رہے لیکن یہ قیاس صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ جیسا کہ اُس منظوم خط سے جس کے اشعار اوپر نقل کیے جا چکے ہیں معلوم ہوگا وہ ربیع الاوّل ۶۸۷ھ میں لشکر شاہی کے ہمراہ دہلی سے روانہ ہوئے تھے اور جیسا کہ قران السعدین سے معلوم ہوتا ہے ذی الحجہ ۶۸۷ھ میں دہلی واپس آگئے تھے۔ لشکر شاہی دو مہینے کی مسافت کے بعد وسط جمادی الاولیٰ ۶۸۷ھ میں اَوَدھ پہنچا اور جیسا کہ قران السعدین سے معلوم ہوتا ہے

ایک ماہ کے سفر کے بعد خسرو اودھ سے دہلی واپس ہوئے ؎

یک مہ کامل بہ کشیدم عناں
راہ چنیں بود کشش آں چناں (صفحہ ۲۲۲)

اب اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ جمادی الاولی ۶۸۶ھ میں اودھ پہنچ گئے تھے اور اخیر شوال ۶۸۶ھ میں وہاں سے واپس روانہ ہوئے تو ان کے قیام اودھ کی مدت زیادہ سے زیادہ پانچ مہینے ہوتی ہے۔

اس اختلاف کے رفع کرنے کی صورت حسب ذیل ہے۔

جیسا کہ خسرو نے دیباچہ غرۃ الکمال میں بیان کیا ہے کیقباد کی تخت نشینی کے وقت انھوں نے عزلت نشینی ترک کرکے حاتم خاں خان جہاں کی ملازمت اختیار کرلی تھی۔ ایک اور جگہ لکھا ہے کہ جس وقت کیقباد نے اودھ سے مراجعت کرتے ہوئے خان جہاں کو اقطاع اودھ حوالہ کئے تو خسرو خان جہاں کے ساتھ سابق تعلق کی بنا پر اودھ جانے پر مجبور ہوگئے۔

اب اگر یہ مان لیا جائے کہ جلوس معزی اوائل ۶۸۶ھ کے وقت سے خان جہاں اودھ میں تھا، تو خسرو کا تقریباً دو سال تک اودھ رہنا ثابت ہوجاتا ہے۔ اگرچہ یہ امر مسلّم ہے کہ وہ اخیر دفعہ دہلی واپس آنے سے آٹھ مہینے پہلے ممکن ہے کہ محض چند روز کو دہلی آئے ہوئے تھے۔

(۵)

خسرو کی اکثر مثنویوں میں حمد و نعت کے بعد اپنے مرشد سلطان المشایخ حضرت شیخ نظام الدینؒ کی تعریف ہوتی ہے۔ خمسہ کی تمام مثنویوں اور عشیقہ اور نہ سپہر میں یہ التزام ہے۔ تغلق نامے کا ابتدائی حصہ موجود نہیں ہے۔ اُس میں بھی اغلباً مدح شیخ ہوگی۔ خمسہ سے پہلے کی مثنویوں میں البتہ یہ التزام نہیں پایا جاتا۔ چنانچہ قران السعدین میں شیخ کی مدح موجود نہیں ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ قران السعدین اور اُس سے پہلی مثنویوں کی تصنیف کے وقت خسرو کے تعلقات شیخ رحمہ اللہ سے پیدا نہیں ہوئے تھے؟

یہ قیاس واقعات کے قطعاً خلاف ہے۔ تحفۃ الصغر میں جو امیر کا پہلا دیوان ہے اور جس میں بیس برس تک کا کلام پایا جاتا ہے، شیخ کی تعریف میں ایک نہایت عمدہ ترکیب بند اور رباعیات اور قطعات موجود ہیں۔ وسط الحیوٰۃ میں بھی مدحِ شیخ میں قصائد وغیرہ ہیں۔

علاوہ اس داخلی سند کے معتبر ترین تاریخی شواہد سے بھی یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچا ہے کہ شیخ کے ساتھ امیر خسرو کے تعلقات کی ابتدا عنفوانِ شباب سے ہوئی۔ اس بارے میں سب سے زیادہ قابلِ وثوق بیانات سیر الاولیا کے مصنف سید محمد مبارک کرمانی (المعروف بہ امیر خورد) کے ہیں جو تقریباً معاصر مورخ کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کے آباؤ اجداد کے حضرت شیخ اور امیر خسرو کے ساتھ نہایت گہرے مخلصانہ اور معتقدانہ تعلقات تھے۔

امیر خورد اپنے باپ کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ جس وقت حضرت شیخ نظام الدین حضرت شیخ فرید الدین کے مرید ہو کر دہلی تشریف لائے ہیں وہ امیر خسرو کے نانا راؤ عرض (عماد الملک) کے مکان میں دو برس تک مقیم رہے (سیر الاولیا صفحہ ۱۰۸)۔ یہ زمانہ امیر خسرو کی آغازِ شاعری کا تھا۔ جو نظم لکھتے تھے حضرت شیخ کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے چنانچہ خسرو نے "طرز صفاہانیان" پر غزلسرائی شیخ کی فرمایش سے شروع کی تھی (سیر الاولیا صفحہ ۳۰۱)

الغرض یہ گمان تو صحیح نہیں ہو سکتا کہ اس مثنوی یا اس پہلی مثنویوں میں مدح شیخ کا موجود نہ ہونا عدمِ تعلقات کا اظہار کرتا ہے لیکن اس فروگزاشت کی کوئی نہایت قوی وجہ ہمارے سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ چونکہ خمسہ کا آغاز شیخ کی بشارتِ روحانی سے ہوا تھا (دیکھو مطلع الانوار خلوت سوم) سب سے پہلے منقبت شیخ کا التزام کرنے کا خیال اسی وقت سے پیدا ہوا اور چونکہ خسرو کا وفورِ عقیدت اور رسوخ روز افزوں ترقی کرتا رہا اس لیے یہ التزام اخیر تک قایم رہا۔

(۶)

مثنوی قران السعدین کا ایک شعر تاریخی دلچسپی رکھتا ہے۔ خسرو نے کشتی کی تعریف میں لکھا ہے ؎

ماہِ نو کاصلِ وے از سال خاست
گشت یکے ماہ بدہ سال راست (صفحہ ۱۴۵)

کہتے ہیں کہ جس وقت مولنٰا جامی نے اس شعر کو دیکھا تو انھیں سال اور ماہ کے معنی سمجھنے میں بہت کچھ تردد ہوا۔ بالآخر اُنھوں نے اس شعر کی تفسیر میں ایک رسالہ تصنیف فرمایا اور بحث کا خاتمہ اس پر کیا کہ:۔

"چیزے خواستہ کہ بزبانِ ہند مخصوص باشد"

نفائس المآثر کا مصنّف کہتا ہے کہ جب سلطان حسین مرزا کے زمانے میں شیخ جمالی دہلوی خراسان گئے تو اُن کی ملاقات مولانا جامی سے بھی ہوئی۔ مولانا نے اس شعر کے معنی شیخ سے دریافت کیے تو شیخ نے کہا کہ "سال" دراصل ایک لکڑی کا نام ہے جس سے ہندوستان میں کشتی بنائی جاتی ہے۔[1]

خسرو نے اور بھی جابجا ہندی الفاظ کا آزادی سے اپنے یہاں استعمال کیا ہے اور اُن سے طرح طرح کے لطایف اور صنایع و بدایع پیدا کیے ہیں بالخصوص اس قسم کے الفاظ سے بکثرت مفید ایہام نکالے ہیں۔[2]

یہ قصّہ ہمیں خسرو کی شاعری کی ایک اہم اور سبق آموز خصوصیت یاد دلاتا ہے جس کو یہاں مختصر طور پر بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

دنیا کے بڑے آدمیوں کے حالات کا مُطالعہ کرتے وقت (خواہ وہ زندگی کے کسی شعبے سے تعلق رکھتے ہوں) یہ دیکھا جاتا ہے کہ کہاں تک وہ اپنے حالات ماحول کا ماحصل تھے اور کس حد تک اُنھوں نے بذاتِ خود گرد و پیش کے حالات پر اثر ڈالا اور

[1] یہ تمام قصّہ ہشت آسمان میں لکھا ہے (دیکھو صفحہ ۲۰)۔ [2] مثلاً خزائن الفتوح میں ہندی اسماء اور اعلام کو تحریف سے محفوظ رکھنے کے لیے اس قسم کی پُر لطف صنعتوں کا استعمال کیا ہے۔ ۱۲

اُن کو تبدیل کرنے میں حصہ لیا۔ تاریخ جہاں ایک طرف بڑے آدمی بناتی ہے وہاں دوسری طرف بڑے آدمی تاریخ بناتے ہیں۔

خسرو دونوں لحاظ سے ہندوستان کی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک طرف وہ اس دور کے صحیح نمائندہ ہیں اور دوسری طرف ہندوستان کی تاریخ پر اُن کا گہرا اثر پڑا ہے۔

دنیا کے بڑے آدمی اچھے ستاروں کے اجتماع کے وقت پیدا ہوتے ہیں۔ خسرو نے بھی کسی ایسی ہی گھڑی جنم لیا تھا۔ جس عہد میں پیدا ہوئے اُس کی "ترکیب ثلاثہ" اپنے ساتھ لیے ہوئے آئے اور اُن کی شاعری تمام آبائی "قومی اور ملکی اثرات سے ملکر پیدا ہوئی۔ اُن کے باپ خالص ترک تھے، لیکن اُن کی ماں عماد الملک "راوت" کی بیٹی اور نسلاً ہندی تھیں۔ اُن کے باپ کا سایہ صغر سنی ہی میں اُن کے سر سے اُٹھ گیا اور اُنھوں نے اپنی ماں کی گود اور نانا کی سرپرستی میں نشو و نما پائی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری سراسر ایسے جذبات اور خیالات سے معمور ہے جنھیں وطن اور گھر کے اثرات کے علاوہ ماں کی جانب سے ورثہ طبعی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اُنکی آبائی زبان ترکی تھی اور قومی اور علمی زبان فارسی۔ جو اُس عہد میں ہندوستان کے مُسلمانوں میں مشترک زبان کے طور پر بولی اور لکھی جاتی تھی۔ لیکن خسروؒ کی مادری زبان ہندوستانی تھی، جسے وہ اسقدر عزیز رکھتے اور وقتاً فوقتاً اپنے شاعرانہ جذبات کے اظہار کا آلہ بناتے تھے۔ اسی وجہ سے اُن کی شاعری بحیثیتِ مجموعی ہندوستان کے اُس دلچسپ دور کا آئینہ ہے جس وقت

ملک کے مختلف عناصر میں امتزاج و اختلاط ہو رہا تھا اور اہلِ ملک کے لیے زبان، جذبات اور خیالات کی آمیزش اور موافقت کی شاہراہ تیار ہو رہی تھی۔

ملک کی اس مشترک تہذیب کی ترقی میں خسرو کا خاص حصّہ ہے۔ وہ وطن کی محبّت کو ایمان سمجھتے تھے۔ اس حق کو انھوں نے خوب ادا کیا ہے اور حب الوطنی کے جذبات کو ہر طرح مضبوط کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح خیالات اور زبان کی آمیزش سے مشترک زبان کی بنیادیں جمانے اور اتحادِ خیالات پیدا کرنے میں جو حصّہ لیا ہے وہ کسی تفصیل کا محتاج نہیں ہے۔

جو سوت آج سے سات سو برس پہلے پہیلیاں اور گیت ہو کر چھوٹا تھا وہ آج سمندر ہو گیا ہے اور اس برِاعظم کی تسخیر کے لیے موجیں مار رہا ہے۔ جو سُریلے راگ مسعود سعد سلمان اور خسرو نے ملکی زبان میں نکالے تھے وہ میر اور غالب، درد اور سودا، انیس اور میر حسن کے چھپے بن گئے ہیں۔ جو آواز اس ہندوستانی شاعر نے ملک کی حمایت اور محبت میں بلند کی تھی وہ آج تمام ملک کی صدا ہو گئی ہے اور آوازِ بازگشت کے طور پر حالی اور اقبال کے دلکش نغموں میں سنائی دیتی ہے۔ مبارک ہے وہ شخص جو تاریخ کے صحیح رجحانات کو پہچانتا اور اُن کی تائید اور ترقی میں ساعی ہو کر بعد کی نسلوں میں اپنا نام ہمیشہ کے لیے نیکی اور محبت کے ساتھ یاد کیے جانے کے واسطے چھوڑ جاتا ہے۔

آؤ اس تمہید کو ختم کرنے سے پہلے مثنوی قران السعدین کے اخلاقی نتیجہ پر غور کریں۔ جس طرح باپ اور بیٹے میں اختلاف کے بعد صُلح ہو گئی جسے شاعر نے مبارک

سمجھ کر "قرانُ السعدین" قرار دیا اسی طرح ملک کا پریشان شیرازہ آپس کی محبت سے یکجا ہو سکتا ہے۔ اُس وقت کے لیے قرانُ السّعدین سے خسروؔ کی یہ غزل بطور "پیامِ اُمید" سن رکھنی چاہیئے۔ جن سچّے اور پاکیزہ انسانی جذبات کی ان اشعار میں ترجمانی کی گئی ہے اُن کی صحیح قدر اُسی وقت ہو سکتی ہے جب ہم اُن سے اخوّت و یگانگت کو مضبوط کرنے اور محبّت و رواداری کو ترقی دینے میں مدد لیں، جس کے ساتھ مستقبل وطن کی اُمیدیں وابستہ ہیں ؎

خرّم آں لحظہ کہ مشتاق بیارے برسد / آرزومند نگارے بہ نگارے برسد
دیدہ بر رُئے چو گُل بندد و بوید خبرش / گرچہ در دیدہ ز نوکِ مژہ خارے برسد
لذّتِ دیدنِ دیدار بجاں کار کند / جانِ بیکار شدہ باز بکارے برسد
گرچہ در دیدہ کشد ہیچ غبارے نبود / ہر کجا از قدمِ دوست غبارے برسد
لذّتِ وصل نداند مگر آں سوختۂ / کہ پس از دُوریِ بسیار بیارے برسد
قیمتِ گل نشناسد مگر آں مُرغِ اسیر / کہ خزاں دیدہ بود پس بہارے برسد

خسروا یار تو گرمی نرسد خود می کوش / بہرِ تسکینِ دلِ خویش کہ آرے برسد (صفحہ ۱۹۲)

(کلیاتِ عناصرِ دواوینِ خسرو)

سیّد حسن برنی